Fikr-o-Nasar (Islamabad) 13:7 (1976)
© rasailojaraid.com

اسلام میں حزبِ اختلاف کا تصوّر

احمد حسن :

اسلام میں نظامِ حکومت بلاشبہ جمہوری ہے۔ جمہوریت کی اصطلاح سے عام طور پر مغربی طرز کا جمہوری نظامِ حکومت سمجھا جاتا ہے جس میں عوام کی مرضی سے آئین بنایا جاتا ہے، قوانین وضع کئے جاتے ہیں، اور عوام کے مطالبہ پر ہی ان میں ردوبدل کیا جاتا ہے۔ مغربی طرز کی جمہوریت میں عوام اپنے نمائندوں کے ذریعہ بالواسطہ حکومت میں دخیل ہوتے ہیں اور عوام کی مرضی کے خلاف ملک میں کوئی نظام نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ مغرب میں یہ جمہوری نظام تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ شخصی و استبدادی حکومتوں سے برسرپیکار رہنے کے بعد وجود میں آیا اور اب شخصی حکومت کی جگہ عوام کی حکومت نے لے لی ہے۔ ملک میں عام انتخابات کے بعد اکثریتی پارٹی جو حزبِ اقتدار کہلاتی ہے، حکومت کرتی ہے اور اقلیتی پارٹیاں جنہیں حزبِ اختلاف کہا جاتا ہے حکومت پر تعمیری تنقید کرتی ہیں، تاکہ حکومت کے کاموں میں توازن قائم رہے۔ اسلامی نظامِ حکومت شخصی و مغربی جمہوری طرزِ حکومت کے بین بین ایک متوازن نظام ہے۔ اس کو نہ تو کلی طور پر شخصی حکومت کہا جا سکتا ہے اور نہ مغربی اصطلاح کے مطابق جمہوری نظام۔ شخصی حکومت اس لئے نہیں کہ اسلامی نظامِ حکومت میں مشوریٰ کا اصول، اساسی حیثیت رکھتا ہے جمہوری اس لئے نہیں کہ اس نظامِ حکومت کی بنیاد عوام کی مرضی پر نہیں، کتاب و سنّت پر ہوتی ہے۔ انتظامی اور ایسے دیگر امور جن کے بارے میں واضح احکام کتاب و سنّت میں موجود نہیں ہوتے، عوام یا ان کے اہل الرائے نمائندوں سے مشورہ ضرور کیا جاتا ہے، لیکن پورا نظامِ حکومت ان کی مرضی سے نہیں چلتا۔ نیز اسلام میں اکثریت کی رائے حق کا معیار نہیں ہے۔ حق کا معیار اسلامی اصول ہیں۔ اسلامی طرزِ حکومت پر جمہوریت کا اطلاق اس لئے ہوتا ہے کہ خلیفہ یا سربراہِ مملکت اس میں بغیر مشورہ کے اپنی مرضی سے قوانین وضع نہیں کر سکتا۔ اس لئے حضرت عمرؓ خلافت کے

بارے میں فرمایا کرتے تھے:۔

لاخلافۃ الا عن مشورۃ — مشورہ کے بغیر خلافت جائز نہیں۔

اسلام میں خلیفہ کتاب وسنت کے منصوص احکام اور مشورہ سے طے شدہ قوانین کو نافذ کرتا ہے اور کتاب وسنت کے احکام کا وہ بھی اسی طرح پابند ہے جس طرح عام مسلمان۔ اسی لئے ابتدا ہی میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اسلامی نظام حکومت میں حزب اختلاف وحزب اقتدار جیسے دو مستقل فریق نہیں پائے جاتے۔ تاہم شورائی نظام سے یہ بات نکلتی ہے کہ اسلام میں ایسے امور ہیں جن میں نصوص موجود نہیں ہیں آزادئ رائے وفکر اور اختلاف کی وسیع گنجائش ہے اور یہی جمہوریت کی اساس ہے

جہاں تک شوریٰ کی اہمیت کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں قرآن مجید میں دو آیتیں ملتی ہیں جن سے اجتماعی امور میں مشورہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پہلی آیت یہ ہے:۔

وشاورھم فی الامر واذا عزمت فتوکل علی اللہ — اور ان سے اہم امور میں آپ مشورہ کیجئے اور جب رائے پختہ کرلیں تو خدا پر بھروسہ کریں۔ (آل عمران: ۱۵۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اگرچہ وحی نازل ہوتی تھی، اور بیشتر امور میں وحی کے ذریعہ آپ کی رہنمائی کردی جاتی تھی، لیکن آپ کو مشورہ کا حکم اس لئے دیا گیا کہ آئندہ نزول وحی کا سلسلہ منقطع ہونے والا تھا۔ اس لئے تنازعی امور میں فیصلہ کرنے کا ایسا طریقہ بتلایا گیا جو وحی کے منقطع ہونے کے بعد کارآمد ہوسکے۔ یہی طریق تھا جس کا آپؐ نے اپنی زندگی میں عملی طور پر نمونہ پیش کیا، اور انقطاع وحی کے بعد خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام اسی اصول پر عمل پیرا رہے۔

دوسری آیت یہ ہے:

وامرھم شوریٰ بینھم (الشوریٰ: ۳۸) — اور ان کا کام آپس کے مشورہ سے ہوتا ہے۔

اس آیت میں امت مسلمہ کے معاشرتی وسیاسی نظام کی خصوصیت بتلائی گئی ہے۔ ان دونوں آیتوں میں لفظ امر سے مراد اہم امور بھی ہوسکتے ہیں اور حکومت سے متعلق امور بھی۔ دونوں کو ملا کر اہم سیاسی ومعاشرتی امور پر بھی اس کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔

مشورہ کی ترغیب متعدد احادیث میں دی گئی ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلعم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی سے مشورہ طلب کرے تو اس کو ضرور مشورہ دینا چاہیئے۔
ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ جو شخص اپنے بھائی کو ایسے کام کا مشورہ دے جس کے بارے میں اسے یہ علم ہو کہ اس کی بھلائی اس کام کے علاوہ دوسرے کام میں ہے. تو اس نے اسی شخص کے ساتھ خیانت کی۔[۳] ایک روایت میں ہے کہ جو شخص مشورہ سے کام کرے گا وہ کبھی نادم نہیں ہوگا۔[۴]
ترمذی کی ایک طویل روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے جملہ امور جب تک باہمی مشورہ سے طے پلتے رہیں گے دنیا میں ان کے وجود اور زندگی کو بقا ملتی رہے گی۔ جب یہ نظام ختم ہو جائے گا اور معاملات عورتوں کے سپرد ہو جائیں گے تو ان کا عدم وجود بہتر ہے۔[۵]
مشورہ کے سلسلہ میں آپؐ نے صرف اس کی زبانی ترغیب پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اپنی زندگی میں بے شمار امور میں صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ آپ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ سے اس کثرت سے مشورہ کرتے کہ آیت وشاورھم فی الامر کے بارے میں یہ سمجھا جانے لگا کہ شاید یہ ان دونوں ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ لیکن یہ وہ سارے امور ہوتے جن کے بارے میں کتاب اللہ میں کوئی واضح حکم موجود نہ ہوتا۔
آپؐ کی زندگی میں ہی بعض صحابہ کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ جن امور کے بارے میں احکام موجود نہیں ہیں بعد میں ان کا فیصلہ کس طرح ہوگا۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے آپ سے ایک بار دریافت کیا کہ آپ کے بعد اگر ہمیں ایسے واقعات پیش آئیں جن کے بارے میں کتاب و سنت میں کوئی حکم موجود نہ ہو تو ان کا فیصلہ کس طرح کریں۔ آپ نے فرمایا، میری امت کے نیک لوگوں کو (عابدین) جمع کرو۔ اور اس معاملہ میں آپس میں مشورہ کرو۔ اور کسی ایک کی رائے سے اس کا فیصلہ نہ کرو۔[۶] چنانچہ صحابہ نے آپؐ کی وفات کے بعد اسی اصول پر عمل کیا۔ اور خلفائے راشدینؓ کی مجلس شوریٰ کے ارکان کے نام تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

اس تمہید سے یہ بات واضح ہوئی کہ اسلامی نظامِ حکومت شورائی ہے۔ ظاہر ہے کسی مسئلہ کے بارے میں مشورہ کی صورت میں مجلسِ شوریٰ کے تمام ارکان یا تمام اہل الرائے کا ہمیشہ کسی ایک بات پر متفق ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اہل الرائے کے درمیان اختلاف ناگزیر ہے۔ اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے امور میں جن کے بارے میں قطعی احکام موجود نہیں۔ غور و فکر اور اختلاف رائے کی اجازت ہے، اور اہل الرائے ایسے امور میں آزادی کے ساتھ اپنی رائے اور

مشورہ دے سکتے ہیں۔ عہدِ نبوی میں مشورہ کے وقت ہر شخص کو اپنی رائے دینے کا حق حاصل تھا، اور اس میں کسی کو کوئی رکاوٹ نہیں تھی بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رائے وفہم سے کوئی فیصلہ فرما دیتے، لیکن صحابہ اس کو مناسب نہ سمجھتے۔ تاہم اس مسئلہ میں اپنی رائے دینے سے پہلے یہ ضرور دریافت کرلیتے کہ جو فیصلہ آپؐ نے فرمایا ہے وہ وحی کے ذریعہ ہے، یا اپنی رائے سے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوجاتا کہ آپؐ نے اپنی رائے سے فیصلہ فرمایا ہے تو اس کے بعد کوئی مشورہ دیتے حباب ابن المنذر ایک صحابی ہیں - ان کو جنگی معاملات میں بڑی مہارت اور بصیرت حاصل تھی۔ متعدد غزوات میں انہوں نے آپؐ کو لشکر کے قیام اور ایسے ہی دیگر امور کے بارے میں بہت سے مفید مشورے دیئے۔ جنگِ بدر کے موقع پر آپؐ کے حکم سے اسلامی لشکر نے ایک ایسی جگہ قیام کیا جو مناسب نہ تھی۔ یہ دیکھ کر انہوں نے آپؐ سے پوچھا، اے اللہ کے رسولؐ جس مقام کو آپؐ نے پسند فرمایا ہے کیا خدا نے اس کے بارے میں کوئی حکم نازل کیا ہے، تاکہ ہم اس سے نہ آگے بڑھیں نہ پیچھے ہٹیں، یا یہ معاملہ رائے، جنگ اور چال کا ہے؟ جب انہیں یہ معلوم ہوگیا کہ یہ معاملہ رائے کا ہے، اس کے بعد انہوں نے اپنا مشورہ دیا۔ ایسا ہی سوال انہوں نے غزوۂ خیبر کے موقع پر بھی کیا کہ جو فیصلہ آپؐ نے کیا ہے، اس کا اگر آپؐ کو کوئی حکم ملا ہے تو ہم اس کے بارے میں بالکل بات نہیں کریں گے۔ اگر معاملہ رائے و مشورے کا ہے تو ضرور بات کریں گے جب انہیں یہ اطمینان ہوگیا کہ معاملہ رائے کا ہے تو اس کے بعد انہوں نے مشورہ دیا۔ اور آپؐ نے اس مشورہ پہ عمل کیا۔

خلافتِ راشدہ میں آزادیٔ رائے وفکر کے مواقع عہدِ نبوت کے مقابلہ میں زیادہ تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس وقت وحی کا سلسلہ بند ہوچکا تھا، اور اختلافی امور میں لوگ آزادی سے سوچنے لگے تھے۔ آپؐ کے وصال کے فوراً بعد خلافت کا مسئلہ پیش آیا۔ اس معاملہ میں آپ کی طرف سے کوئی متعین حکم موجود نہ ہونے کی وجہ سے صحابہ نے آزادیٔ رائے سے کام لیا اور شدید اختلاف کے باوجود یہ مسئلہ مشورہ سے حل ہوگیا حضرت عمرؓ وابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں بھی لوگ اختلافی مسائل پر آزادی سے مشورے دیتے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں عراق کی فتح کے بعد وہاں کی زمینوں کی تقسیم کا مسئلہ تھا۔ صحابہ کو اصرار تھا کہ ان کو فوج کے درمیان تقسیم کردیا جائے۔ اور حضرت عمرؓ ان کو حکومت کی ملکیت میں رکھنا چاہتے تھے۔ عرصہ تک اس پر بحث جاری رہی اور جانبین سے دلائل پیش ہوتے رہے۔ بالآخر حضرت عمرؓ کی رائے مان لی گئی اور سب نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یک زبان ہوکر کہا کہ الرائے کہ سر ﷺ یلک یعنی صحیح رائے آپؐ ہی کی ہے۔

آزادی رائے کا نتیجہ اختلاف کی صورت میں ضرور نکلتا ہے لیکن اس اختلاف کے بھی فوائد ہیں نزاعی مسائل میں اہل الرائے کو اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کا موقع ملتا ہے۔ بحث وتمحیص سے زیر بحث مسئلہ کے تمام پہلو اجاگر ہوجاتے ہیں اور جو جو شکلیں بھی اس مسئلہ کے حل کی ممکن ہوں سب منظر عام پر آجاتی ہیں مجلس شوریٰ میں مختلف صلاحیتوں کے لوگ ہوتے ہیں، اور ہر شخص اپنی عقل وفہم، ذکاوت وفراست تجربہ اور ذہنی صلاحیت کے مطابق رائے دیتا ہے اس لئے اجتماعی فیصلوں میں اصابت رائے کے زیادہ مواقع ہیں۔ اختلاف رائے سے ہی رائے عامہ ہموار ہوتی ہے۔ اختلاف رائے ایک زندہ متحرک، صحت مند اور آزاد معاشرہ کی علامت ہے اور جس سے تعمیر میں مدد ملتی ہے۔ ترقی کی نت نئی راہیں کھلتی ہیں اور قومیں آگے بڑھتی ہیں تاہم اختلاف تعمیری بھی ہوسکتا ہے اور تخریبی بھی یہ اختلاف رائے امت میں وحدت کا سبب بھی بن سکتا ہے اور تفریق کا بھی۔ اسی لئے اختلاف مذموم بھی ہے اور محمود بھی۔

امام شافعیؒ نے کتاب الرسالہ میں اختلاف پر ایک مستقل باب قائم کیا ہے ان کے نزدیک اختلاف کی دو قسمیں ہیں،

۱۔ حلال (محمود) ۲۔ حرام (مذموم) ان کا خیال ہے کہ کتاب وسنت میں جو احکام منصوص ہیں ان کے بارے میں اختلاف قطعاً ناجائز ہے اور ایسا اختلاف بھی مذموم ہے جس سے امت میں تفریق، گروہ بندی اور انتشار پیدا ہو اس قسم کے اختلاف کی مذمت قرآن مجید نے بھی کی ہے۔ ارشاد باری ہے:

۱۔ وما تفرق الذین اوتوا الکتاب الامن بعد ماجاءتھم البینۃ (البینۃ: ۴)	جو لوگ اہل کتاب تھے وہ واضح دلیل آنے کے بعد اختلاف میں پڑ گئے۔
۲۔ ولاتکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ماجاءھم البینات (آل عمران: ۱۰۵)	اور تم اُن لوگوں کی طرح مت ہوجانا جو واضح دلائل پہنچنے کے بعد تفرق اور اختلاف میں پڑ گئے۔

امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ قرآن مجید نے ایسے امور میں اختلاف کی مذمت کی ہے جن کے بارے میں واضح احکام اور دلائل موجود نہ ہوں۔ اختلاف کی دوسری قسم حلال اور محمود ہے۔ یہ وہ امور ہیں جن میں تاویل، قیاس، اور رائے کی گنجائش ہو۔ جیسے سمت قبلہ کی تعیین میں اختلاف۔ یا گواہوں کے عادل ہونے میں اختلاف۔ اس قسم کے سینکڑوں مسائل ہیں جن میں صحابہ، تابعین، اور مجتہدین کے

درمیان اپنے اپنے دلائل کی بنا پر اختلاف پایا جاتا ہے۔[9]

اس محمود اختلاف کی طرف ایک حدیث میں اشارہ موجود ہے؛

اختلاف امتی رحمة [10] میری اُمت کا آپس میں اختلاف رکھنا ایک رحمت ہے۔

اگر ہم ہر قسم کے اختلاف کو مذموم ہی سمجھیں تو بے شمار مسائل میں تعبیر و تاویل کی وسعت کی بنا پر جو مختلف نقطہ ہائے نظر اُمت میں پائے جاتے ہیں ان سب کو بھی ہمیں مذموم کہنا ہوگا۔ جو ہمارے خیال میں صحیح نہیں۔ اختلاف کے فوائد جو اوپر بیان کئے گئے ہیں اور اس وقت امت میں جو مختلف مکاتب فکر پائے جاتے ہیں۔ ان کی روشنی میں اس حدیث کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ یہ حدیث کثرت میں وحدت، اور اختلاف کے باوجود اتحاد کی راہ دکھاتی ہے اس حدیث کو مستقبل میں امت کے درمیان اختلافات کے بارے میں پیشین گوئی بھی کہا جا سکتا ہے۔

اسلام میں جس اختلاف کی مذمت کی گئی ہے وہ گروہ بندی و تفرقہ بازی اور محاذ آرائی ہے جو آزادی رائے و فکر کی ہی ایک انتہائی صورت ہے۔ اور ایسا اختلاف ہمیشہ مہلک ثابت ہوا۔ صحابہ کے درمیان اختلافات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سے شروع ہو گئے تھے فتوحات کے بعد صحابہ مختلف علاقوں میں پھیل گئے جس سے ان اختلافات میں مزید وسعت پیدا ہوئی بعد میں انہی اختلافات کی بنا پر ملت میں متعدد مکاتب فکر وجود میں آئے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں اجتماعی فیصلوں کے ذریعہ ہی اختلافات کو کم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اختلاف کو کلی طور پر ختم نہ کر سکے۔

احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں بعض صحابہ کے درمیان اختلاف ہوا۔ اور بعض امور میں وسعت کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں رایوں کو مستحسن قرار دیا۔ مثلاً عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو قرآن مجید کی ایک آیت پڑھتے سنا۔ ان کی قرأت اس سے مختلف تھی جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے سنا تھا۔ میں انہیں آپؐ کے پاس لے گیا۔ اور اس واقعہ کا ذکر کیا (ہمارے درمیان اس اختلاف کی بنا پر) میں نے آپؐ کے چہرہ پر ناپسندیدگی کے آثار محسوس کئے۔ آپؐ نے فرمایا۔ تم دونوں نے ٹھیک پڑھا؛

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اختلاف مت کرو (یعنی آپس میں نہ جھگڑو) تم سے پہلے لوگوں نے آپس میں اختلاف کیا، اور اس کے نتیجہ میں وہ ہلاک ہو گئے" جس سے امت میں تفریق پیدا ہو اس کی مذمت میں ہمیں بکثرت احادیث ملتی ہیں۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ایما رجل خرج یفرق بین امتی فاضربوا ۔ جو شخص میری امت میں تفریق پیدا کرنے کے لئے نکلے اس کی گردن مار دو۔

عنقہ ۱۲

امت کی وحدت و شیرازہ بندی آپ کی نگاہ میں اتنی اہم تھی کہ نماز کی صفوں میں ذرا سی بے قاعدگی کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے، فرماتے "برابر کھڑے ہو، آگے پیچھے نہ ہو، ورنہ تمہارے دل ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے"[۱۳] اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اختلاف رائے اور تفرقہ بازی و محاذ آرائی دو مختلف چیزیں ہیں۔

یہ بات واضح رہے کہ صحابہ ڈرتے ڈرتے ایک دوسرے سے اختلاف کرتے تھے اور انہیں بھی یہ خوف لاحق رہتا کہ اس سے کہیں امت میں انتشار اور تفرقہ پیدا نہ ہو جائے۔ حضرت عثمانؓ حج کے زمانہ میں جب مکہ تشریف لائے تو منیٰ میں قصر نماز نہ پڑھی۔ چار رکعتیں پڑھیں۔ حالانکہ باہر سے آنے والے مسافرت کے سبب دو رکعتیں پڑھتے۔ عبداللہ بن مسعود نے بھی ان پر اعتراض کیا۔ لیکن خود بھی چار رکعتیں ادا کیں۔ یہ دیکھ کر لوگوں نے ان سے پوچھا: عبت علی عثمان ثم صلیت اربعا یعنی تم نے حضرت عثمانؓ پر اعتراض کیا اور خود چار رکعتیں پڑھیں؟ ابن مسعود نے جواب دیا:

الخلاف شر ۱۴ مخالفت بری بات ہے۔

صحابہ اجتہادی مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف کرتے، اور اپنے اپنے دلائل پیش کرتے، لیکن ان میں اپنی رائے کے بارے میں ضد، ہٹ دھرمی، اور تعلی نہیں ہوتی تھی۔ ان میں گروہی عصبیت نہیں تھی کہ حق کو حق جاننے کے باوجود اپنی رائے پر محض ہٹ دھرمی اور عصبیت کی بنا پر اڑے رہیں۔ اپنی رائے و فکر کو محض شخصی و انفرادی رائے سمجھتے، اور قطعی احکام کے مقابلہ میں اس کو ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھتے۔ مجتہد فیہ مسائل میں اپنی رائے دیتے وقت ان کی احتیاط ملاحظہ ہو۔ مہر مثل کے مسئلہ میں عبداللہ بن مسعود کا زید بن ثابت اور ابن عمر سے اختلاف ہوا، مسئلہ یہ تھا کہ ایک عورت کا نکاح ہوا لیکن مہر مقرر نہیں ہوا۔ ہاتھ لگانے سے پہلے اس کے

خاوند کا انتقال ہوگیا تو کیا اس عورت کو مہر ملے گا؟ ابنِ عمر اور زید بن ثابت نے یہ رائے دی کہ اس کو مہر نہیں ملے گا۔ عبداللہ بن مسعود نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس کو مہر مثل ملے گا۔ لیکن اس رائے کا اظہار کرنے کے بعد ان کے الفاظ یہ تھے:

فان یکن صوابا فمن اللہ وان یکن خطأ فمنی ومن الشیطان واللہ ورسولہ بریئان ۱۵	اگر یہ رائے درست ہے تو منجانب اللہ ہے اور اگر غلط ہے تو میری اور شیطان کی طرف سے ہے اللہ اور اس کے رسولؐ بری ہیں۔

بعد میں ایک صحابی معقل بن سنان نے اس کی تصدیق کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ میں یہی فیصلہ فرمایا تھا۔

اسلام میں اختلاف رائے اور آزادیٔ فکر صرف آپس میں ایک دوسرے پر تنقید و نکتہ چینی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ عوام کو حکومت پر تنقید کا حق بھی دیا گیا ہے۔ ذیل کی آیت سے یہ بات صاف طور پر سمجھ میں آتی ہے:۔

یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الآخر ذالک خیر واحسن تاویلا۔ (النساء: ۵۹)	اے ایمان والو! تم اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو، اور جو لوگ تم میں اہلِ حکومت ہیں ان کی بھی، اور اگر کسی امر میں باہم تمہارا اختلاف ہو تو اس کو اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹاؤ۔ اور اگر تم اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، تو یہ امور بہتر ہیں، اور ان کا انجام خوشتر ہے۔

لفظ ان تنازعتم سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ مسلمان اپنے اولی الامر سے اختلاف کا حق رکھتے ہیں۔ یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ اختلاف کی صورت میں فیصلہ کتاب وسنّت کی روشنی میں ہوگا۔ یعنی جس کی رائے کتاب وسنّت کے زیادہ قریب ہوگی، یا اسلام کے عام مسلّمہ اصول وقواعد کے مطابق ہوگی، اس کی رائے پر فیصلہ ہوگا۔ اس آیت میں یہ نہیں بتایا گیا کہ خلیفہ یا رئیسِ مملکت سے اختلاف کی صورت میں فیصلہ کون کرے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے مختلف حالات میں اس کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں، اور اپنے اپنے حالات وزمانہ کے مطابق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمانوں کو اس کا اصول خود وضع کرنا ہوگا۔

قرآن مجید کی آیت واذا عزمت فتوکل علی اللہ سے اشارۃً یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مشورہ کے بعد اختلاف کی صورت میں فیصلہ کا حق خلیفہ کو ہے۔ خواہ وہ اکثریت کی رائے مانے یا اقلیت کی یا اپنی طرف سے کوئی فیصلہ دے، جو ملک، قوم اور دین کے مفاد میں ہو۔ اور مصلحت اسی کی متقاضی ہو۔ خلافتِ راشدہ میں تینوں قسم کی مثالیں ملتی ہیں، کبھی فیصلہ اکثریت کی رائے کے مطابق ہوا، کبھی اقلیت کی رائے کے مطابق، اور کبھی خلیفہ نے اپنی رائے پر عمل کیا۔

خلافتِ راشدہ تک تو یہ اصول درست ہو سکتا ہے، کیونکہ اس وقت خلیفہ کے انتخاب میں بے حد احتیاط برتی جاتی تھی، اس کی امانت، ذہانت، اہلیت، صلاح و تقویٰ پر سب کو اعتماد ہوتا تھا۔ لیکن موجودہ دَور میں خلیفہ کو مشورہ کا پابند ہونا ضروری ہوگا، اگر ایسا نہیں کیا گیا تو اول تو مشورہ کا کوئی فائدہ نہیں رہتا، دوم یہ کہ اس سے استبداد کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ مشورہ کے بعد اختلاف کی صورت میں فیصلہ کا اصول اپنے حالات کے مطابق مسلمانوں کو وضع کرنا چاہیئے خواہ وہ اکثریت سے ہو یا کسی اور طریقہ سے ہو۔

علمائے اصول نے اجماع کے انعقاد کے سلسلہ میں اکثریت و اقلیت کے مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ آیا اکثریت کے فیصلہ کو اجماع کہا جا سکتا ہے یا نہیں جمہور کا خیال یہ ہے کہ اکثریت کے فیصلہ کو اجماع نہیں کہہ سکتے، جب تک سارے کے سارے مجتہدین یا شرکائے مجلس ایک بات پر متفق نہ ہو جائیں۔ تاہم محمد بن جریر طبری، ابوبکر رازی، ابوالحسین خیاط اور احمد بن حنبل (ایک روایت کے مطابق) کی رائے یہ ہے کہ اکثریت کی رائے کو اجماع کہا جائے گا۔ ایک فریق کا خیال ہے کہ اقلیت کی تعداد اگر تواتر تک پہنچ جائے تو وہ انعقاد اجماع میں مخل ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔ ابوعبداللہ جرجانی کی رائے یہ ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں اجتہاد کی گنجائش ہو اور امت میں وہ متنازع فیہ رہا ہو تو اس میں اقلیت کی رائے معتبر ہوگی، اور اجماع منعقد نہیں ہوگا جیسے مسئلہ عول میں ابن عباس کا اختلاف ہے۔ لیکن کسی مسئلہ میں اگر اجتہاد کی گنجائش نہ ہو، اور امت میں وہ متنازع فیہ نہ رہا ہو، تو ایسے مسئلہ میں اکثریت کی رائے پر اجماع منعقد ہوگا، اور اقلیت کی رائے کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر متعہ اور ربا الفضل کے مسائل ہیں۔ ان میں حضرت ابنِ عباس کا اختلاف معتبر نہیں۔ اس لئے

اجماع اکثریت کی رائے پر ہے۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ اکثریت کی رائے حجت ہے، اجماع نہیں۔ یعنی اکثریت کی رائے قابلِ عمل ہے۔ لیکن اس کو اجماع کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اکثریت کی رائے پر عمل کرنا بہتر ہے اور اقلیت کی رائے پر عمل کرنا بھی جائز ہے۔ آمدی کے نزدیک مذہب مختار یہ ہے کہ اکثریت کے فیصلہ کو اجماع نہیں کہا جا سکتا۔ آمدی نے اس فریق کے دلائل جس کے نزدیک اکثریت کی رائے کو اجماع کہا جا سکتا ہے تفصیل سے نقل کئے ہیں اور ان کا ایک ایک کر کے جواب دیا ہے اور آخر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کلی اتفاق رائے سے جو فیصلہ ہوگا وہی اجماع ہے[14] تاہم نظری طور پر تو یہ بات مانی جا سکتی ہے لیکن عملی طور پر ایسا بہت کم ہوتا ہے اور اہل الرائے شاذ و نادر ہی سب کے سب ایک رائے پر متفق ہو پاتے ہیں۔

حکومت پر تنقید و نکتہ چینی کی مثالیں خلافتِ راشدہ میں بکثرت ملتی ہیں۔ وحی کا سلسلہ بند ہونے کے بعد اب کسی کو یہ ڈر نہیں تھا کہ خلیفہ کوئی فیصلہ وحی کے ذریعہ کرے گا۔ اس لئے عام مسلمان آزادی سے حکومت پر تنقید کرتے۔ اور خلفاء یا تو ان کی تنقید کا جواب دیتے یا اپنے قوانین کو بدلتے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مانعین زکوٰۃ سے جہاد کرنے کا جب فیصلہ کیا تو لوگوں نے ان کے اس فیصلہ سے اتفاق نہیں کیا۔ تاہم حضرت ابوبکرؓ نے اپنے دلائل سے ان کو قائل کیا۔ اور ملکی و دینی مصالح کے پیشِ نظر ان سے جہاد کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت اسامہ کے لشکر کو رومیوں سے جنگ کے لئے بھیجنے سے تمام صحابہؓ کو روکا۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان کو یہ کہہ کر لاجواب کر دیا کہ جس لشکر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روانہ فرمایا ہو ابوبکرؓ کی کیا مجال کہ اس کو روک سکے۔ عہدِ نبوت میں مولفۃ القلوب کو زکوٰۃ میں سے حصہ دیا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسی روایت کے مطابق ان کو حصہ دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے اعتراض کیا اور یہ دلیل پیش کی کہ اسلام کو اب غلبہ ہو چکا ہے، اب اس کی ضرورت نہیں۔

حضرت عمرؓ اگرچہ بڑے رعب و دبدبہ کے خلیفہ تھے۔ لیکن اجتماعی امور اور ملکی معاملات میں وہ اہل الرائے صحابہ سے مشورہ کرتے۔ اور لوگ کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرتے بعض اوقات ان کے کاموں پر تنقید بھی کرتے۔ مالِ غنیمت کی چادریں تقسیم ہوئیں تو ہر ایک کے حصہ میں ایک ایک چادر آئی حضرت کو بھی ایک چادر ملی۔ لیکن دو چادروں کی آپ نے اپنی قمیص بنائی۔ لوگوں نے یہ دیکھکر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ پر اعتراض کیا۔ اس کا جواب ان کے صاحبزادے عبداللہ بن عمرؓ نے دیا کہ ایک چادر میں نے اپنے والد کو اپنے حصہ کی دی ہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں لوگ مہر مقرر کرنے میں اعتدال سے تجاوز کرنے لگے تھے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے ارادہ کیا کہ اس کی کوئی حد مقرر کرنا چاہیئے چنانچہ اپنے ایک خطبہ میں اس کا اظہار فرمایا: اے لوگو! عورتوں کا مہر مقرر کرنے میں حدِ اعتدال سے آگے نہ بڑھو۔ اگر یہ دنیا میں کوئی عزت کی چیز ہوتا، یا خدا کی نظر میں تقویٰ و پرہیزگاری کا سبب ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ مستحق تھے۔ آپؐ نے اپنی ازواج مطہرات و صاحبزادیوں میں سے کسی کا مہر بارہ اوقیہ سے زیادہ مقرر نہیں فرمایا۔ یہ سن کر ایک خاتون کھڑی ہوئیں اور کہا: اے عمرؓ خدا تو ہمیں دے رہا ہے، اور تم ہمیں اس سے محروم کر رہے ہو۔ کیا قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتا: وآتیتم احداھن قنطارا فلا تاخذوا منہ شیئاً (النساء: ۲۰) یعنی اور تم ان میں سے ایک کو کثیر مقدار میں مال (قنطار = سونے کا ڈھیر) دو' تو اس میں سے ذرا بھی واپس نہ لو۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا: اصابت امرأۃ واخطأ عمر " ایک عورت نے ٹھیک بات کہی اور عمرؓ سے خطا ہوئی۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے سر جھکا لیا۔ ایک خلیفہ راشد کی یہی شان ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک خاتون کے سامنے نہیں حق کے سامنے گردن جھکائی تھی۔ اس کے بعد آپ نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

نہاوند کی جنگ میں حضرت عمرؓ خود شریک ہونا چاہتے تھے۔ صحابہ کی نظر میں ان کی شرکت ملکی و دینی مفاد کے خلاف تھی اس لئے انہوں نے اپنی تقریروں میں حضرت عمرؓ کی اس تجویز پر تنقید کی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ جنگ میں شریک ہونے سے رُک گئے۔ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

دورِ عثمانیؓ میں حکومت پر تنقید و نکتہ چینی اعتدال کی حد سے بڑھ گئی تھی۔ اس کا سبب کچھ تو حضرت عثمانؓ کی حلیم و نرم طبیعت تھی۔ اس کے علاوہ ان کے زمانہ میں کبار صحابہؓ جو اسلام کے سچے خدمت گزار اور جاں نثار تھے ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہوتے جاتے تھے۔ ان کی تعداد روز بروز کم ہو رہی تھی۔ اور ان کی جگہ نئی نسل لے رہی تھی جس میں اپنے اسلاف جیسا خلوص و ایثار نہیں

تھا، بلکہ جوش و جذبہ زیادہ تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمانوں نے جن اقوام و مذاہب کو زیرنگیں کیا تھا ان میں انتقامی جذبات مخفی طور پر موجود تھے۔ آئے دن وہ خلافت کو نقصان پہنچانے کے لئے سازشیں کرتے رہتے تھے۔ اسی قسم کے دیگر اسباب کی بنا پر مخالفین کو ان پر سخت تنقید و اعتراض کا موقع ملا۔ اور ان پر مندرجہ ذیل الزامات لگائے:

۱۔ کبار صحابہ کو معزول کر کے ان کی جگہ اپنے خاندان کے ناتجربہ کار لوگوں کو مقرر کیا۔

۲۔ بیت المال کا روپیہ ناجائز طور پر خرچ کیا۔

۳۔ بعض صحابہ کے ساتھ ناروا سلوک کیا۔

۴۔ بقیع کی چراگاہ کو اپنے لئے مخصوص کر لیا۔

۵۔ بدعنوانیوں پر چشم پوشی کی۔

۶۔ حدود کے نفاذ میں غفلت برتی۔

۷۔ ایک مصحف کے علاوہ دیگر مصاحف کو جلا دیا۔

۸۔ منیٰ میں قصر نماز نہیں پڑھی۔

۹۔ شاذ روایتوں پر عمل کیا۔

۱۰۔ حکم بن العاص کو جسے مسجد نبوی میں جلاوطن کر دیا گیا تھا دوبارہ مدینہ بلا لیا۔

۱۱۔ مصری وفد کے ساتھ بدعہدی کی۔

ہمیں یہاں اس بات سے بحث نہیں کہ یہ الزامات کہاں تک درست تھے۔ تاہم حضرت عثمانؓ نے ان کا جواب دیا جو تاریخ کی کتابوں میں تفصیل سے مذکور ہے۔

نجی ملکیت کے بارے میں حضرت ابوذر غفاری کا اپنا مخصوص نظریہ تھا۔ اور عام صحابہ ان سے اختلاف کرتے تھے۔ تاہم وہ حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ پر ملکیت و تقسیم و دولت کے بارے میں تنقید کرتے تھے۔

حضرت علیؓ کا عہدِ خلافت بہت ہنگامہ خیز تھا۔ مسندِ خلافت پر قدم رکھتے ہی تنقید، نکتہ چینی اور الزام تراشی شروع ہو گئی۔ حضرت معاویہؓ نے بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور حضرت علیؓ پر الزامات لگائے۔ ان میں ایک الزام یہ تھا کہ انہوں نے باغیوں سے مقابلہ کر کے حضرت عثمانؓ کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حفاظت نہیں کی۔ دوسرے قاتلین عثمانؓ ان کے اعوان، انصار اور مشیر کار ہیں، اور انہوں نے ان کو پناہ دی ہے۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ پر اکثر اعتراضات محض غلط فہمیوں کی بنا پر تھے۔ اسی لئے حضرت علیؓ نے بھی ان کی تنقید و اعتراضات کا جواب دیا۔ اور ان کو ہر چند سمجھانے کی کوشش کی۔ تاہم نکتہ چینی، غلط فہمی اور الزام تراشی کا سلسلہ بڑھتا رہا جس کے نتیجہ میں جنگِ صفین، جنگِ جمل اور خوارج کے ساتھ معرکے پیش آئے۔ اور مسلمانوں کی جو تلواریں مشرکین و منکرینِ اسلام کے سامنے بے نیام ہوتی تھیں، خود ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگیں۔ اور ان جنگوں کے نتیجہ میں بے شمار صحابہ شہید ہوئے۔ اس کے بعد ہی سے امت مختلف فرقوں میں تقسیم ہو گئی اور حضرت عثمانؓ کی وہ پیشین گوئی درست نکلی کہ اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو تا قیامت نہ تم ایک ساتھ نماز پڑھوگے، اور نہ ایک ساتھ جہاد کروگے۔ یہ انتہاپسندانہ اختلاف کا نتیجہ تھا۔

یہ بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے کہ اسلام نے جس تنقید و نکتہ چینی کی حوصلہ افزائی کی ہے وہ تعمیری ہے، تخریبی نہیں جس کے مہلک نتائج حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں ظاہر ہوئے۔ خلیفہ و عوام، یا حزبِ اقتدار و حزبِ اختلاف دونوں ہی حکومت کے ذمہ دار ہیں۔ دونوں ہی کا مقصد ملک کی فلاح و استحکام ہوتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے دونوں مل کر کام کرتے ہیں۔ خلافتِ راشدہ میں ایسی نظیر ہمیں نہیں ملتی کہ ایک گروہ محض اقلیت میں ہونے کی بنا پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ خوارج نے حضرت علیؓ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا، اور آخر میں ان کی نکتہ چینی، تخریبی کارروائی اور قتل و غارت گری حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں، اس لئے ان کو ختم کر دیا گیا۔ شیعانِ علی بھی بنو ہاشم کو خلافت کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے، اور ہر خلیفہ پر برابر نکتہ چینی کرتے تھے۔ تاہم ان کی حیثیت بھی موجودہ دور کے حزبِ اختلاف جیسی نہیں تھی۔ اس قسم کی انتہاپسندانہ تنقید کو چھوڑ کر ماضی میں تمام خلفاء کے دور میں اہل الرائے حکومت پر تعمیری تنقید کرتے تھے۔ جس کی مثالیں دی جا چکی ہیں۔

پروفیسر ارنسٹ بارکر (ERNEST BARKER) نے حزبِ اختلاف و اقتدار کے فرائض اور ان کے باہمی تعلق پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ پارٹیاں خواہ دو ہوں یا زیادہ اسمبلی میں حزبِ اقتدار و حزبِ اختلاف کی حیثیت سے دو طرف بیٹھیں گی۔ دونوں کا مقصد باہمی مذاکرات، تبادلۂ خیال، بحث و مباحثہ اور مشاورت ہے۔ باہمی بحث و تمحیص کے ساتھ دونوں فریق مل

کو ملکی معاملات کو تعاون و مفاہمت کے جذبہ سے چلانا ہے۔ عام طور پر حزبِ اختلاف کی نکتہ چینی تو منظرِ عام پر آجاتی ہے لیکن ان کے تعاون و مفاہمت کا جذبہ جو ان میں ہمیشہ موجود رہتا ہے پس منظر میں چلا جاتا ہے اور اکثریتی پارٹی اس کو تسلیم نہیں کرتی۔ قانون سازی کا عمل دونوں کے تعاون سے ہی وجود میں آتا ہے۔ دیکھنے میں تو قانون سازی میں دو فریق شریک ہوتے ہیں لیکن دونوں اس طرح تعاون و مفاہمت سے کام کرتے ہیں کہ ایک ہی فریق معلوم ہوتے ہیں۔ دونوں کی کوشش کے نتیجہ میں قانون بنتا ہے، صرف ایک کا کام تعمیر اور دوسرے کا تعمیری تنقید ہے اور مجلسِ قانون ساز کے یہی دونوں اجزاء ترکیبی ہیں مجلسِ قانون ساز کے یہ دونوں اطراف ایک ہی وقت میں ایک دوسرے کے مخالف بھی ہیں اور ایک دوسرے کے شریک بھی۔ موجودہ نظام اٹھارھویں صدی کے نظام سے بالکل مختلف ہے جس میں دونوں کا طریقۂ کار بالکل جداگانہ تھا اور اشتراک کا کوئی عنصر موجود نہ تھا۔ موجودہ نظام میں دونوں فریق ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں اور مسلسل باہمی عمل کے ذریعہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دونوں اپنے دائرۂ اختیار میں کام کرتے ہوئے اس طرح توازن قائم رکھتے ہیں کہ اپنی پالیسیاں اور تجاویز ایسی پیش کرتے ہیں جہاں سے وہ کسی ایک نقطہ پر جمع ہو سکیں، اور پوری قوم کی مرضی حاصل کر سکیں۔ حکومت کے اعمال کے احتساب کے لئے اتحاد کی بھی ضرورت ہے اور اختلاف کی بھی۔ وحدت کی فضا قائم رکھتے ہوئے اختلاف برائے موجودہ جمہوری نظام کا اساسی اصول ہے۔[19]

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حکومت کے لئے حزبِ اقتدار و حزبِ اختلاف لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں کی اپنی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ محض اکثریت یا مخالفت کی بناء پر کسی ایک کو اپنی رائے پر نہیں اڑنا چاہیئے۔ حق کو حق سمجھتے ہوئے اس کی مخالفت کرنا، اور عصبیت کی بناء پر اپنی جماعت کا ساتھ دینا دورِ جاہلیت کا شعار ہے۔ اسلام سے پہلے عرب بھی یہی کہتے تھے انصر اخاک ظالما کان او مظلوما یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ اسلام نے اس میں یہ ترمیم کی کہ ظالم کی بھی تم مدد کرو، لیکن اس طرح کہ اس کو ظلم و ناانصافی سے روک دو۔ حزبِ اقتدار ہو یا اختلاف، دونوں کو خلوص، نیک نیتی، دیانت، امانت اور خیر خواہی کے جذبہ سے کام کرنا ہے حدیث میں ہے کہ دین خیر خواہی کا نام ہے آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ خیر خواہی کس کیلئے؟ آپؐ نے فرمایا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ و رسولؐ مسلمانوں کے ائمہ اور عام مسلمانوں کے لئے[۲۰]۔ اسلامی حکومت میں حزبِ اقتدار و اختلاف دونوں ہی اس حدیث کا مظہر ہوتے ہیں۔

حواشی:۔ (۱) علی المتقی، کنز العمال، حیدرآباد دکن۔ جلد ۳۔ صفحہ ۱۳۶ (۲) سنن ابنِ ماجہ۔ کتاب الادب۔ تفسیر ابنِ کثیر۔ جلد ۱۔ صفحہ ۴۲۰ (۳) سنن ابوداؤد، کتاب العلم۔ (۴) قرطبی۔ الجامع لاحکام القرآن۔ جلد ۴ صفحہ ۱۴ (۵) ایضاً ج ۱۴ صفحہ ۳۰۸۔ جامع ترمذی۔ کتاب الفتن (۶) محمود آلوسی۔ روح المعانی۔ قاہرہ۔ جلد ۲۔ صفحہ ۴۶۔ (۷) واقدی۔ کتاب المغازی۔ آکسفورڈ۔ جلد ۱ صفحہ ۵۳۔ ابن سعد طبقات۔ جلد ۳۔ ق ۲۔ صفحہ ۱۰۹۔ (۸) ایضاً ج ۲۔ صفحہ ۳۴۶ (۹)۔ امام شافعی۔ کتاب الرسالہ۔ قاہرہ۔ ۱۹۴۰ء۔ صفحہ ۹۱ – ۵۶۰ (۱۰) حافظ سیوطی نے جامع صغیر میں اس حدیث کو نقل کیا ہے لیکن اس کے ماخذ کا انہیں بھی علم نہیں۔ صحاح ستہ اور حدیثؐ کی دیگر مشہور کتابوں میں کہیں اس حدیث کا وجود نہیں۔ طبرانی اور دیلمی نے "اختلاف اصحابی لکم رحمۃ" کے الفاظ نقل کئے ہیں اور اس کو بھی ضعیف کہا ہے۔ علامہ تمنا عمادی نے اپنے رسالہ اختلافِ امت رحمت ہے یا زحمت؟ (مطبوعہ تمنا اکیڈمی۔ ڈھاکہ، صفحہ ۲۴) میں اس حدیث کی مفصل تحقیق کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ امت میں جب اختلاف بڑھا تو اس کی وجہ جواز میں اس حدیث کو وضع کیا گیا واللہ اعلم نیز دیکھیے روح المعانی جلد ۴ صفحہ ۴۴ (۱۱) بخاری۔ الجامع الصحیح۔ کتاب الانبیاء۔ و فضائل القرآن۔ (۱۲) سنن النسائی۔ تحریم الدم۔ (۱۳) مسلم۔ الصحیح۔ کتاب الصلوٰۃ۔ (۱۴) سنن ابوداؤد۔ کتاب المناسک بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے مکہ میں قیام کی نیت کر لی تھی اس لئے پوری نماز پڑھی۔ (۱۵) محمد بن الحسن۔ موطا۔ دیوبند۔ صفحہ ۵۰ – ۲۴۹ (۱۶) آمدی الاحکام۔ قاہرہ۔ ۱۹۱۴ء۔ جلد ۱ صفحہ ۲۳۶–۲۳۷ مابعد (۱۷) قرطبی۔ الجامع لاحکام القرآن۔ جلد ۵۔ صفحہ ۹۹ (۱۸) حضرت عثمانؓ پر یہ اعتراضات تاریخ کی تمام مشہور کتابوں میں موجود ہیں۔

(۱۹) Ernest Barker, Principles of social and Political Theory, Oxford 1967, PP 266-68

(۲۰) بخاری۔ الجامع الصحیح۔ کتاب الایمان۔ صحیح مسلم۔ کتاب الایمان۔